تبصرے

میری دو سابقہ تصنیفات ''بے ادبیات'' اور ''اوراقِ مُصوَّر'' پر مختلف تبصرے شائع ہوئے لیکن دوستوں نے ایک اور راہ اختیار کی یعنی ان دونوں تصنیفات کا بیک وقت تعارف کرانے کے لیے غالب اکاڈمی، بستی نظام الدین، نئی دہلی میں ایک مجلس کا اہتمام کر ڈالا۔ ۱۲/اپریل ۲۰۰۳ء کو منعقد ہونے والی اس مجلس میں جو مقالے پڑھے گئے وہ خاصے طویل اور تفصیلی تھے۔ فی الحال انہی مضامین کے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ اُس وقت موقع کی مناسبت سے مقالہ نگاروں کے پیشِ نظر دونوں کتابیں رہی ہوں گی اس لیے ان پر تبصرے بھی خلط ملط ہو گئے۔ یہاں ان دونوں کتابوں کے ذیل میں ان سے متعلق تبصروں کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ دراصل اس تصنیف کے قاری کو دونوں سابقہ تصنیفات سے الگ الگ متعارف کرانا مقصود ہے۔

پہلی تصنیف تو ''بے ادبیات'' ہے جس کی اشاعت نے ایسا تاثر چھوڑا جو میری غرض وغایت نہ تھی۔ میں صرف بعض سماجی کمزوریوں کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا لیکن اس آئینے میں مجھے خود اپنا چہرہ ٹیڑھا نظر آنے لگا۔ پھر اس شبیہ کی اصلاح کی غرض سے اگلی تصنیف ''اوراق مصور'' کو منظرِ عام پر لایا۔ ذیل میں ان دونوں تبصروں کے درمیان ربط برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

''اوراق مصور''

ہمارے تہذیبی استعارے جو شہروں کی شکل میں ابھرتے تھے وہ سب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ذہنی افق سے ہمارے تہذیبی حوالے منہدم ہوتے جا رہے ہیں۔

اصفہان، شیراز، سمرقند، بخارا یہ سب ہماری تہذیب کے گہوارے اور استعارے تھے۔ ان شہروں کی تہذیب میں ہماری تہذیب زندہ تھی اور ان کی موت سے ہماری تہذیب پر مرگ طاری ہوا۔

شہر شناسی ایک بہت بڑا فن ہے۔ ہمارے عرب مورخین نے شہر نگاری کی ایک اچھی روایت قائم کی۔ رضوان اللہ صاحب نے ''اوراقِ مصور'' میں دراصل اس شہر کے ایک ایک منظر نامے کو حیاتِ نو عطا کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ہندوستان کی سانسوں میں دھڑکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مثنوی کی صنف کا سہارا لیا ہے۔ مثنوی کا مروجہ فارم کیا ہے یا اس کی ہیئت کیا ہے اس بحث سے قطع نظر رضوان اللہ کی مثنوی اپنے مفاہیم اور معانی کی ترسیل میں مکمل طور سے کامیاب ہے۔

رضوان اللہ صاحب کی اس مثنوی میں صرف تاریخیت نہیں ہے بلکہ ایک پراسرار شمولیت بھی ہے۔ جب شہر کی سانس میں اپنی سانس شامل ہو جائے تو پھر شہر، آدمی کی سانسوں کی طرح دھڑکنے اور مہکنے لگتا ہے۔ کلکتہ شہر کی شناخت میں اپنی شمولیت رضوان اللہ صاحب نے کمال ہنرمندی سے دکھائی ہے۔ اسی طرح ان کا دلی نامہ محض دلی کا ایک منظر نامہ نہیں ہے بلکہ دلی نامہ اور مثنوی کلکتہ میں ان کے دل کی دھڑکنیں ہیں جن میں بہت سے معانی اور مفاہیم مضمر ہیں جن کی تفہیم وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی جائے گی۔ ''اوراقِ مصور'' کلکتہ کا کولاژ ہے اور اس میں شبدوں سے جو چتر کاری کی گئی ہے وہ تصویریں نہایت حسین ہیں۔ اس میں فکر و معانی اور لفظیات کا حسن سمٹ آیا ہے۔

دراصل میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ آج اس دور میں رضوان اللہ کا دم غنیمت ہے کہ وہ زبان و بیان پر مکمل قدرت بھی رکھتے ہیں اور ان کی تحریریں معلومات سے بھرپور بھی ہیں۔ وہ ایک صاحبِ کمال شاعر بھی ہیں اور طنز نگار بھی اور اس علمی روایت سے وابستہ ہیں جو ان دنوں معدوم ہوتی جاتی ہے۔

آج زوال کا عروج ہے۔ اس لیے اس انبوہِ زوال پرستاں میں یہ کتاب کھو جائے گی مگر آنے والا زمانہ یقیناً ''اوراقِ مصور'' کے حوالے سے نیا ڈسکورس قائم کرے گا تب اس میں

مضمر معلومات کا سمندر لوگوں کو مبہوت اور متحیر کرے گا۔ ''اوراقِ مصور'' میں عرفان وآگہی کی شمع روشن ہے۔

حقانی القاسمی

مہاجروں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جو شہران کے لیے تقویت اور تحفظ آسانی سے فراہم کرتا ہو وہ اسی کے ہو جاتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب نے بے وطنی اور وطنیت کے حوالے سے بحث کر کے اس کلیے کو غلط ثابت کرتے ہوئے اس سچائی پر ہم لوگوں کا یقین پھر مستحکم کیا ہے کہ جس شہر میں فکر ونظر نے آنکھیں کھولی ہوں وہی شہر پوری شخصیت پر محیط ہو جاتا ہے۔

''اوراقِ مصور'' کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوا کہ رضوان اللہ علمی صاحب کلکتہ کی ہر سڑک پر، ہر بھیڑ میں ہر تجربے میں، ہر مرحلے میں میرے ساتھ اور میری عمر کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ، جن کی کن پٹیوں کے بال اب سفید ہو رہے ہیں، موجود تھے.....اپنے اس دور کے لوگوں کے احساسات اور جذبات میں نہ صرف بے تکلفی سے حصہ دار بنے بلکہ ان تمام چیزوں کو اپنے حافظہ کا حصہ بنایا اور اب ایک مربوط فکر کی صورت میں اسے اظہار کا پیرایہ بھی عطا کیا۔

اس کتاب کے تعارف میں ممتاز اور محترم نقاد شمیم حنفی نے لکھا ہے ''رضوان اللہ صاحب نے ایک طویل مثنوی اور دو مختصر نظموں کے اس مجموعہ کو ''اوراقِ مصور'' کا نام دیا ہے۔ رضوان صاحب کے شعور میں جو وسعت، نظر میں جو گہرائی اور زبان وبیان میں جو غیر معمولی ذہانت اور شائستگی جھلکتی ہے۔ انہی روایتوں کا عطیہ ہے۔ مثنوی کے فارم سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو اس طویل نظم کو ہم بیان کے ایک تدریجی سلسلے میں پروئے ہوئے کا نتوز سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہر جزو اپنے آپ میں مکمل بھی ہے اور اپنے ماقبل اور سابقہ سے مربوط بھی ہے۔''

اس طرح کی طویل نظم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ رضوان صاحب نے مثنوی جیسی صنف کا سہارا لیا۔ اس کے تقاضے بھی انھوں نے اسی دیانت داری سے پورے کیے جس

دیانتداری سے پہلے صحافت کے تقاضے نبھا رہے تھے اور اب ادب کے تقاضے نبھا رہے ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ کوئی شخص تین دہائیوں کی دوری پر کھڑا ہو کر کلکتہ کو دیکھنے اور دکھانے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ رضوان اللہ صاحب کلکتہ میں رچے بسے ہیں اور کلکتہ رضوان صاحب میں رچا بسا ہے۔ فکری سطح پر ایسا ادغام دیکھنے کو نہیں ملا۔

اشہر ہاشمی

''اوراقِ مصور'' دراصل ایک مثنوی ہے جس میں کلکتہ کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے آپ (رضوان اللہ) نے کلکتہ میں ۲۷ قیمتی سال گزارے ہیں اس لیے آپ نے کلکتہ کی تاریخ منظوم کرنے کو اپنے اوپر فرض کر لیا تھا، اسی فرض اور قرض کی ادائیگی کا عملی نمونہ ہے ''اوراقِ مصور''۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے جنھوں نے کلکتہ نہیں دیکھا ہے یہ کتاب ایک بائیسکوپ کی مانند ہے جو ہمیں اس شہر کی ایک جھلک دکھا کر اس کا دیوانہ بنا دیتی ہے۔

''اوراقِ مصور'' میں کلکتہ کی تاسیس، وہاں کی سرکردہ شخصیات، مشاعرے صحافتی خدمات، قحط بنگال، ۱۹۴۶ء کے فسادات، تقسیم بنگال، نکسلی تحریک کلکتہ میں ہونے والی ہڑتالیں، وہاں کا کلچر اور پھر وہاں کے معروف مقامات، کیا کچھ نہیں ہے اس کتاب میں۔

''اوراقِ مصور'' کے مطالعہ کے وقت کہیں نظیر اکبر آبادی یاد آجاتے ہیں تو کہیں ڈاکٹر اقبال لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رضوان اللہ صاحب کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے۔ ان کے قلم کی انفرادیت پوری کتاب میں جلوہ گر ہے، مثنوی کے پیرائے میں اپنے احساسات کو پیش کیا ہے۔

سہیل انجم

بے ادبیات:

میں سمجھتا ہوں کہ مزاح نگاروں کے پاس ایک ایسا آئینہ ضرور ہوتا ہے جس میں وہ مستقبل کے منظر نامے کو محسوس کرتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب بھی بنیادی طور پر طنز و مزاح کے آدمی ہیں، میرا خیال ہے کہ مزاح وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے پاس دنیا بھر کی معلومات اور

اطلاعات کا وافر ذخیرہ ہو۔ مزاح کی ایک ایک سطر میں معلومات کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ مزاح اور معلومات کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ مزاح کے لیے جس شارپنس، جس قادر الکلامی، جس طباعی اور خلاقی کی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی اور چیز کے لیے نہیں پڑتی.....مزاح کی چند سطریں لکھنا اور ان سطروں میں سمندر کو کوزے میں قید کر کے قاری کو باندھ لینا جوئے شیر لانے جیسا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے مزاح میں سب سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔

میں مزاح میں جتنی سنجیدگی اور وقار محسوس کرتا ہوں اتنی تو تنقید کی سنجیدہ تحریروں میں بھی نظر نہیں آتی۔ مزاح کے لیے پورے وجود کی بیداری ضروری ہوتی ہے۔ حواس جب مکمل طور پر جاگتے ہیں تبھی مزاح معرضِ وجود میں آتا ہے۔ رضوان اللہ صاحب کے اندر یہ خوبی ہے کہ ان کے سارے حواس بیدار ہیں، ان کی آنکھیں چاروں دِشاؤں میں شنکر کی طرح پھیل ہوئی ہیں جو تمام منظر نامے کا مکمل احاطہ کر لیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رضوان صاحب نے طنز و مزاح کے میدان میں بیش بہا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ آج کا بے حس، بے خبر اور اقربا پرور، گروہ بند ادبی حلقہ شاید ان کی عظمت کا اعتراف نہ کرے مگر آنے والے زمانے میں جب یہ ساری خرافات، واہیات نیست و نابود ہو جائیں گی اور ایک نیا ادبی منظر نامہ تشکیل پائے گا تو ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا اور یہ بالکل مبالغہ نہیں بلکہ بالکل سچی بات ہے۔ مزاح میں جس علوئے ذہنی اور ارتفاعِ فکری اور نشاطِ قلبی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بدرجۂ اتم رضوان اللہ صاحب میں موجود ہے۔ ان کی تحریر میں ایک تیر نیم کش کی سی کیفیت ہے جسے پڑھنے کے بعد آدمی مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔

حقانی القاسمی

''بے ادابیات'' اور ''اوراقِ مصور'' رضوان اللہ صاحب کی شخصیت کے دو بالکل متضاد پہلو ہیں۔ ایک میں طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ دوسرے میں سنجیدہ شاعری کی جادو بیانی۔ جنھوں نے صرف ''بے ادبیات'' کا مطالعہ کیا ہے انہیں بھی میری طرح یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ آنجناب لطیف اور باریک پیرائے میں جتنا گہرا طنز کرتے ہیں سنجیدہ شاعری میں بھی اپنی شخصیت کی اتنی ہی

گہری چھاپ چھوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں اور شاعری کے ذریعہ طنز مزاج کے نشتر لگانے کے ساتھ ساتھ اپنی نثری تحریروں سے بھی سماجی برائیوں کا اس انداز سے آپریشن کرتے ہوں کہ آپریشن کرانے والا ہنسی خوشی اس کو جھیل جائے۔

سہیل انجم

اپنی ساری عمر صحافت کے پیشے میں گزارنے کے دوران اہلِ دنیا کا تماشہ دیکھنے اور آس پاس کے لوگوں کے رویوں سے زخمی ہونے کی وجہ سے کبھی کبھار منہ کا مزہ بدلنے یا دل کا غبار نکالنے کی خاطر رضوان اللہ صاحب طنزیہ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے۔ لیکن انہیں شائع کرانے سے گریز کرتے رہے۔ وہ بہترین شاعر اور بہترین نثر نگار بھی ہیں، اور ان کی شاعری اور نثر کا شاہکار بھی اس مجموعہ مضامین اور نظم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے میں نثر پاروں کو انہوں نے ''بے ادبیات'' کا عنوان دیا ہے اور اس کے تحت ۲۶ مختلف مضامین شامل ہیں۔ چند مضامین کے عنوان اس طرح ہیں: ایک بکرے میں دو قربانی، پیٹنٹ کرالو، جہیز، کمزوریوں کا شرطیہ علاج، دعوتِ افطار، ری سائیکلنگ، فرنچ کٹ تعلیم اور سندباد کا آخری سفر۔

اسی طرح طنزیہ اور مزاحیہ نظموں کا عنوان ''بدنظمیاں'' ہے۔ غزلیات کے تحت زیادہ تر پرانے شعراء کی غزلوں کی مزاحیہ تضمین کی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ہمارے بعض کالم نویس مزاح نگاروں کی طرح انھوں نے واقعات اور چٹکلوں کا سہارا لے کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کا ہر جملہ اپنے آپ میں ایک ایسی طنزیہ کاٹ رکھتا ہے جو قاری کو جھنجھوڑ بھی دیتی ہے اور زیرلب مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔

پیش لفظ شمیم حنفی کا لکھا ہوا ہے لیکن یہاں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ آخر میں اعمال نامہ کے تحت اپنی زندگی کے کوائف بھی دیئے ہیں۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے اور اردو کے ہر قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔

م۔ر۔ف